نئے لسانی علوم اور اُردو تنقید

ڈاکٹر اسلم انصاری*

Abstract:
This is essay highlights the importance of Linguistics as the basis of new philosophy in art and literature. It aims to argue that the basic ideas of linguistics are essential now to develop a new understanding of literary texts and characteristic style features of the writers. This argument has been supported from several books s written in English and Urdu that demonstrate the importance of stylistics in the study and analysis of literary texts.

تنقید کی کوئی سی بھی تعریف متعین کی جائے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فلسفے کی طرح تنقید بھی علوم کے مجموعے کا نام ہے، فرق یہ ہے کہ فلسفہ جن علوم سے عبارت ہے وہ اکثر و بیشتر یکساں رہتے ہیں جیسے مثلاً اخلاقیات، جمالیات، نفسیات اور مابعد الطبیعات جو فلسفے کے بنیادی علوم ہیں اور ایک طویل عرصے سے فلسفے کے لازمی اجزائے ترکیبی ہیں لیکن تنقید کی صورتِ حال اس سے ذرا مختلف ہے۔ تنقید جن علوم سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے طریق کار اور اپنے مقاصد کو متعین کرتی ہے، اُن کی ترجیحات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

بیسویں صدی کی وسطی دہائیوں کی معروف فلسفی خاتون سوزن لینگر اپنی کتاب ''فلسفے کا نیا آہنگ'' کا آغاز اس طرح کرتی ہیں کہ ''فلسفے کی تاریخ کے ہر دور کی کچھ خصوصی دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ اس کے مسائل اس کے اپنے ہوتے ہیں جو سیاسی یا معاشرتی ماحول سے زیادہ ذہنی نشو ونما کا نتیجہ ہوتے ہیں۔'' اپنی کتاب کے ابتدائی پیراگراف میں سوزن لینگر کہتی ہیں کہ فلسفے میں مسائل اور موضوعات اتنے اہم نہیں جتنا سوال کرنے کا طریق کار اہم ہے۔ اس صورت حال کا اطلاق کلی طور پر نہ سہی، جزوی طور پر تنقید پر بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر عہد میں تنقید کی اپنی دلچسپیاں ہوتی ہیں اور ہر عہد کے اپنے مسائل نقاد کے دامن گیر رہتے ہیں لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تنقید صرف طریق کار کا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ نقطۂ نظر کا معاملہ بھی ہے، بہر حال تنقید نے ہر عہد میں مختلف علوم سے روشنی حاصل کی ہے اور یہ صورت حال آج بھی جاری ہے، لیکن جس علم نے تنقید کو سب سے زیادہ مواد، مباحث اور مسائل عطا کیے ہیں، وہ علمِ زبان ہے۔ دیکھا جائے تو تنقید اور علمِ زبان کا تعلق بہت قدیم ہے، خود شاعری اور ادب بھی

* سابق پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج، ملتان۔

ناگزیر طور پر ادیب اور شاعر سے علمِ زبان کی ایک خاص مقدار کا تقاضا کرتے ہیں، تاریخ ادب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زبان کے وسیع تر علم کے بغیر نہ اچھی شاعری تخلیق کی جاسکتی ہے اور نہ اچھی تنقید لکھی جاسکتی ہے۔

اُردو تنقید جس کا آغاز تذکروں کی روایت سے ہوتا ہے، زبان کے علم سے کبھی بے نیاز نہیں رہی۔ برصغیر کا پہلا باشعور ادبی نقاد سراج الدین علی خاں آرزوؔ علمِ زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ وہ برصغیر کی مقامی فارسی کے معیاری ہونے کا بہت بڑا علم بردار اور اردو اور فارسی لغت کا ماہر تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں ایک بہت بڑے ادبی اثر کے طور پر زندہ رہا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ، جنھیں اُن کے بے مثال اسلوبِ نثر کی بنا پر اُردو ادب کی تاریخ میں شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی، بہت گہری تنقیدی بصیرت کے حامل تھے، اُن کے فیصلوں اور ادبی محاکموں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اُن کی تنقیدی بصیرت وسیع تر علمِ زبان پر مبنی تھی۔ وہ اُردو اور فارسی کے علاوہ ہندی یعنی برج بھاشا اور بہت حد تک سنسکرت سے بھی شناسا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''آبِ حیات'' پر ان کا طویل مقدمہ اُردو کے آغاز وارتقا کے حوالے سے اُن طویل مباحث کی بنیاد بنا جو آج اُردو لسانیات کے لیے سرمایۂ افتخار کہے جاسکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا آزاد کا سارا زور ہندی اور فارسی کے محاورے اور استعارات کے اشتراکات کی بحث میں صرف ہوا۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے علمِ زبان کی بنیاد پر اُردو کی شعریات لکھ سکتے تھے، اب بھی ''آبِ حیات'' کو اُس کے مخصوص تبصروں، محاکموں اور ادبی لطیفوں کی بنیاد پر ایک طرح کی شعریات ہی قرار دیا جاسکتا ہے اگرچہ ''آبِ حیات'' کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی اور بعض اوقات تو آزاد کو نقاد ماننے سے ہی انکار کر دیا جاتا ہے۔

مولانا حالیؔ اُردو کے پہلے بڑے نقاد قرار دیئے جاتے ہیں اور اس عمومی فیصلے سے اختلاف کی گنجائش بھی نہیں لیکن ''مقدمۂ شعر وشاعری'' میں جو سچ مچ اُردو کی پہلی کتاب الشعر یا شعریات ہے، زبان کا کوئی بڑا نظریہ بروئے کار آتا دکھائی نہیں دیتا، یہ اور بات ہے کہ شعری زبان کے سلسلے میں مولانا حالی کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا جس کی بنیادی اصطلاح تھی ''مقتضائے حال'' اور ضمنی اصطلاحات تھیں ''سادگی''، ''تاثیر''، ''محاورہ'' وغیرہ۔ مجموعی طور پر مولانا حالیؔ شاعری کے سلسلے میں فطری اور قدرتی زبان کے اسی طرح علم بردار تھے جس طرح انگریزی شاعری اور تنقید میں ورڈز ورتھ۔ یہ اور بات ہے کہ ورڈز ورتھ نے اپنے نظریۂ شعر کی تشریح کے آغاز ہی میں یہ اعتراف کر لیا تھا کہ شاعری کی زبان عام بولی جانے والی زبان سے بہرحال مختلف ہوتی ہے۔ نقدِ شعر وادب میں نظریۂ زبان اور اُس کے نتیجے میں علمِ زبان کی اہمیت کا آغاز اسی خیال سے ہوتا ہے کہ شعر وادب میں زبان کی کارکردگی کے اصول کچھ اور

ہوتے ہیں۔

غرض تنقید جن علوم وفنون سے عام طور پر روشنی حاصل کرتی ہے، اُن میں عمومی علمِ زبان اور علمِ معانی کے علاوہ جمالیات، نفسیات، عمرانیات، بشریات اور تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان علوم کی ترجیحی اہمیت عہد اور زمانے کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اُردو تنقید اپنے معروف معنوں میں مغربی تنقید بالخصوص انگریزی تنقید سے متاثر ہے اور اس کے ابتدائی طریق کار پر انگریزی کے رومانوی شاعروں اور نقادوں کا بہت گہرا اثر رہا ہے۔ عمومی طور پر بیسویں صدی میں اردو تنقید نے زیادہ تر تاریخ، عمرانیات بلکہ عمرانی علوم اور نفسیات سے بہت استفادہ کیا۔ کسی شاعر یا ادیب کا مطالعہ کرتے ہوئے سیاسی اور سماجی پس منظر کو پیش کرنا ایک طویل عرصے تک اُردو تنقید کی ضرورت رہی ہے۔ لیکن نفسیات کے اثرات گہرے ہونے پر جب شاعر اور ادیب کی شخصیت، اُس کا ماحول، اُس کا اُسلوبِ بیان اہم قرار پائے تو جدید نفسیات میں علمِ زبان کی اہمیت کو ایک بار پھر تسلیم کیا گیا۔ علمِ نفسیات نے شعر وادب میں الفاظ کی تہہ داری اور اُسلوب کی گہری معنویت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے زبان کے علم کو مزید اہم ثابت کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مغرب میں باقاعدہ فلسفے کے زوال کے بعد جن فکری تحریکوں نے اہمیت یا مقبولیت حاصل کی، اُن میں وجودیت کو چھوڑتے ہوئے بیشتر تحریکیں ایک طرح سے لسانی تحریکیں ہی تھیں۔ بیسویں صدی کے ہر قابلِ ذکر فلسفی اور ہر قابلِ ذکر نقاد نے اپنا نظریۂ زبان ضرور پیش کیا ہے۔ وہ چاہے کالنگ وُڈ ہو، آئی۔ اے۔ رچرڈز ہو یا کرسٹوفر کاڈویل، ہر بڑے نقاد کے لیے نظریۂ زبان کی تشکیل میں بڑی کشش تھی، اسی طرح اکثر قابلِ ذکر فلسفیوں نے بھی اپنے اپنے طور پر زبان کے نظریے پیش کئے، یہ نظریے ایک طرف تو لسانیات کا حصہ بنتے چلے گئے اور دوسری طرف انھوں نے شعر وادب کی تنقید پر بھی گہرے اور پائیدار اثرات مرتب کئے۔ اپنی گفتگو کے آغاز میں ہم نے سوزن لینگر کا حوالہ دیا تھا اُس کا نظامِ فکر بھی ایک طرح سے نظریۂ زبان ہی ہے، یہ نظریہ زبان کو اُس کے علاماتی مفہوم میں لیتا ہے اور تہذیب وثقافت پر اُس کا اطلاق کرتا ہے۔ اس مختصر گفتگو میں علمِ لسانیات کے آغاز وارتقا پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں، صرف اتنا کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں نشو وارتقا پانے والے اس علم نے اُردو تنقید پر بہت گہرے اثرات ڈالے، صرف اُردو تنقید ہی نہیں دُنیا بھر کی معیاری زبانوں کی ادبی تنقید اس علم سے استفادہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نفسیات، جمالیات اور معاشرتی علوم سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد اُردو تنقید میں نئی وسعتِ نگاہ لسانیات کی بدولت ہی پیدا ہوئی۔ اس علم کی جس شاخ نے تنقید میں سب سے زیادہ جگہ پائی وہ معنیات کی شاخ تھی یعنی Semantics جسے مغربی دنیا کا 'علمِ معانی' قرار دیا گیا اور بیشتر تنقیدی

مباحث میں اس سے استفادہ کیا گیا۔ یہ بات بھی یہاں قابلِ ذکر ہے کہ لسانیات کے ایک اور بنیادی تصور 'ابلاغ' نے بھی جدید تنقید میں کئی مباحث کو جنم دیا اور اظہار و ابلاغ کی اصطلاحات وسیع پیمانے پر استعمال کی گئیں۔ لسانیات کی شاخ semantics اور مصوری کی اصطلاحات Expressionism اور Impressionism نے بھی جدید تنقید میں کئی مباحث کو جنم دیا اور Form and Feeling کی ہم آہنگی کے تصور نے یہ خیال پیدا کیا کہ ہیت وہی وقیع اور مکمل ہوسکتی ہے جو شاعر یا ادیب کے احساسات کو بیان کرے یا اُن احساسات کو بیان کرے جو شاعر کا موضوع ہیں، مُراد یہ تھی کہ شعری آہنگ ایسا ہو کہ موضوع یا خیال اس سے خود بخود ذہن میں اُبھر آئے۔ اُردو شاعری میں مقتضائے حال کا تصور اسی خیال کی تائید کرتا تھا لیکن جدید تصور اس سے قدرے مختلف تھا، بہر حال ہیت پرست نقادوں نے اس نقطے سے خوب فائدہ اُٹھایا اور الفاظ کی صوتی تشریحات کے ذریعے شعر کے معنی یا احساسات کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس میدان میں بڑے نقادوں میں پروفیسر عابد علی عابد سرِ فہرست تھے جنھوں نے قدیم تصوراتِ بلاغت اور معنی کے ساتھ ساتھ اس Semantic اصول کو بھی تفصیل کے ساتھ لاگو کرنے کی کوشش کی کہ شعر یا ادب پارے کے الفاظ کے آہنگ میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مفہوم کو بیان کر دے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عابد علی عابد کے علاوہ اثر لکھنوی اور استاذی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے بھی صوتیات کے اصول سے کام لیتے ہوئے غنائی اور غیر غنائی آوازوں کی بحث کی۔ اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کی تاثراتی تنقید کا تذکرہ بھی کیا جاسکتا ہے جو تنقید کے دوسرے قدیم و جدید تصورات کے ساتھ ساتھ Semantics یعنی جدید علمِ معانی کے اصولوں کو بھی برتتے رہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس صوتیاتی تنقید کے بنیادی تصورات کہاں سے اخذ کیے گئے یا یہ کہ غنائی اور غیر غنائی آوازوں کی تفریق کن بنیادوں پر روا رکھی گئی۔ پروفیسر عابد علی عابد نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''اُصولِ انتقادِ ادبیات'' اور ''اُسلوب'' میں اپنے مخصوص صوتی تصورات کو حروفِ علت اور حروفِ صحیح کی اصطلاحات کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان میں Sematntics کی طرح کا علمی منہاج پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ ایک طرح سے قدیم اصطلاح متجانس اور غیر متجانس آوازوں کی عملی صورت تھی جس کو نئے مشاہدات یا علمی تحقیق سے آراستہ نہیں کیا جاسکا۔ اس کے باوجود یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہونا چاہیے کہ ان اساتذہ نے شعر و ادب کی تنقید کو لسانیات کی اس اطلاقی شاخ کے بہت قریب کر دیا۔

مغرب کے جن بڑے نقادوں نے نفسیات کے علم کو اپنے تنقیدی طریق کار کی اساس بنایا، اُن میں

آئی۔اے۔رچرڈز کو خاص اہمیت حاصل ہے، جن کی کتاب "Principles of Literarary Criticism" کو ادبی تنقید میں دوامی حیثیت حاصل ہے۔آئی اے رچرڈز اُن نقادوں میں سے ہیں جو اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ علوم کی زبان اور ہے اور شعر و ادب کی زبان اور۔اس سلسلے میں وہ دو اصطلاحات Reference اور Attitude کے ذریعے اپنی بات واضح کرتے ہیں، اُن کے خیال میں علمی زبان References یعنی حوالوں کو بروئے کار لاتی ہے جب کہ ادبی زبان Attitudes یعنی رویوں کو پیدا کرتی ہے۔اُن کے خیال میں شعر و ادب کی زبان جذبی یا Emotive ہوتی ہے یعنی اُصولی طور پر جذبات و احساسات سے لبریز۔اس اصطلاح نے جہاں کئی مباحث کو جنم دیا وہاں لسانیات اور فلسفے میں Emotive Language کی مستقل اصطلاح اور بحث بھی پیدا کر دی۔آج Emotive Language جمالیات، نفسیات اور تنقید کی مستقل اصطلاح کا درجہ رکھتی ہے۔وہ زمانہ جب لسانیات کے یہ اطلاقی علوم اُردو تنقید پر اثر انداز ہو رہے تھے اُس زمانے میں بظاہر اُردو تنقید سیاسی و سماجی پس منظر کے ساتھ ساتھ علامت اور استعارے کے مباحث میں کھوئی ہوئی تھی، ان مباحث نے اگرچہ تنقید کو بہت کچھ دیا لیکن اسے استعارے اور علامت کی تنگنائے میں محدود بھی کر دیا۔ استعارہ بذاتِ خود علمِ زبان ، مذہب ، فلسفہ اور نفسیات کی بہت اہم اصطلاح ہے اور اردو تنقید میں آج بھی استعارے اور علامت کی اصطلاح سے پورا پورا کام لیا جا رہا ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ استعارے کی کوئی بحث بھی زبان کی ماہیت کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، گویا استعارے کی بحث بھی ایک طرح سے لسانی علوم کی بحث ہے۔نظمِ جدید کے علم برداروں اور نظمِ جدید کے نقادوں نے استعارے کی ماہیت کو بیان کرتے ہوئے بہت سی اہم لسانیاتی بحثیں کی ہیں۔افتخار جالب کی تحریریں اس کی واضح مثال پیش کرتی ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا نے استعارے کے مقابلے میں علامت کو زیادہ اہمیت دی لیکن استعارہ علامت کی اساس ہے اس لیے بحث استعارے کی ہو یا علامت کی اُس کی لسانی ماہیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں جدید اُردو تنقید میں Emotive Language کے مباحث نے زیادہ جگہ نہیں بنائی اس کے مقابلے میں اطلاقی لسانیات کی جس شاخ نے سب سے زیادہ توجہ حاصل کی وہ اُسلوبیات ہے۔ادبی تنقید کے اعتبار سے اُسلوب کی بحث تنقید کی معرکہ آرا بحثوں میں سے ہے۔اُردو تنقید میں سید عابد علی عابد نے پروفیسر لوکس کے خیالات پر مبنی اُسلوب کے مباحث خوش اُسلوبی سے پیش کئے ہیں لیکن میرے خیال میں تنقیدی اصطلاحات میں اُسلوب کی سب سے عمدہ بحث ڈاکٹر سید عبداللہ نے سر سید احمد خان اور اُن کے رفقائے کار کی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے کی ہے، آج سے تقریباً چالیس پچاس برس پہلے

بھارت میں سعید انصاری نامی ایک نوجوان نے علامہ شبلی نعمانی کے اُسلوب پر ایک بہت نفیس انعامی مضمون لکھا تھا۔ میرے خیال میں اُسلوب کی بحثوں میں اِس مضمون کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہئے تھی۔ یہ تو ادبی تنقید کے اعتبار سے اُسلوب کی بات تھی یہاں مقصود یہ بتانا تھا کہ اُسلوبیات یعنی Stylistics نے جو لسانیات کی ایک اہم اطلاقی شاخ ہے جدید اُردو تنقید میں بہت بار پایا۔ اُسلوبیات آج بھی ایک ترقی پذیر شعبہ علم ہے جو لسانیات، نفسیات اور تنقیدِ ادب میں بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اُسلوبیات دراصل علمِ لسانیات کی روشنی میں ادبی اَسالیب کا معروضی اور علمی مطالعہ ہے جس کے مباحث محنت اور دقتِ نظر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جدید اُردو تنقید اَسالیب کی بحث میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسلوبیات سے بہت کچھ اخذ کر رہی ہے۔ لیکن خالص اُسلوبیاتی منہاج سے کم ہی کام لیا جا رہا ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں اُردو زبان پر مبنی لسانیات کا علم زیادہ ترقی نہیں کر رہا۔ اس کے مقابلے میں پڑوسی ملک میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اُردو پر مبنی لسانیات کا شعبہ ایک عرصے سے قائم ہے جس کے اساتذہ کے تحقیقی کام وقتاً فوقتاً علمی دُنیا کے سامنے آتے رہتے ہیں، ڈاکٹر خلیل بیگ نے فیض احمد فیضؔ کی ایک نظم اور رشید احمد صدیقی کے اُسلوبِ بیان کا اُسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے جو جدید اُردو تنقید میں بھی خاصے کی چیز سمجھا جانا چاہئے۔

نئے لسانی علوم یا لسانی تحریکات نے سب سے اہم اور معروف تحریک ساختیات کی ہے جس کا دائرۂ کار روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے ساختیات نے زبان کے علم میں بہت گرانقدر اضافے کئے ہیں، یہ متن کے مطالعے کا ایک انوکھا طریقہ کار ہے جو ہمیں لکھنے والے کے سیاسی، سماجی پس منظر، ادیب اور شاعر کی شخصیت اور اس کے ذاتی میلانات سے بہت حد تک بے نیاز کرتے ہوئے لفظ کی اہمیت اور اس کے متنی سیاق و سباق کی معنویت سے آگاہ کرتا ہے، اگرچہ ساختیات کے بعد پس ساختیات اور ردِ تشکیل کی تحریکیں بھی وجود میں آ کر اپنے اپنے نقطۂ عروج کو پا چکی ہیں اور بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اِن مؤخر الذکر تحریکوں کے بعد ساختیات کے مباحث قصۂ پارینہ ہو گئے لیکن یہ ایک غلط خیال ہے اس لئے کہ پس ساختیات اور ردِ تشکیل کی تحریکوں کا مرکزی نقطہ بھی ساختیات ہی ہے۔ جدید اُردو تنقید میں ساختیات نے عمومی طور پر کیا اثر ڈالا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا شاید ابھی قبل از وقت ہو اس لئے کہ تنقید کے عمومی مباحث ساختیاتی مسائل سے زیادہ اعتنا نہیں کرتے لیکن ساختیاتی تنقید کے نام سے ایک تنقیدی روش ضرور وجود میں آ چکی ہے جو اُردو شعر و ادب کے متنی مطالعے میں کچھ نئے اِدراکات کا اِضافہ ضرور کر رہی ہے۔ البتہ اِتنی بات میں ضرور عرض کروں گا کہ ساختیاتی تنقید کے علم بردار بظاہر اس بات کی پروا کرتے دِکھائی نہیں دیتے کہ اُن کی بات کسی کی سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔ ساختیاتی تنقید کے چند گِنے چُنے بڑے علمبردار جب ساختیات کی بحث کرتے

ہیں تو اُن کی باتیں بہت حد تک قابلِ فہم ہوتی ہیں لیکن جب وہ اِن نظریات یا اُصولوں یا طریقِ کار کا عملی تنقید میں اِطلاق کرتے ہیں تو اُن کے مباحث بہت حد تک گنجلک اور کبھی کبھی نا قابلِ فہم ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود جدید تنقیدی نظریات میں ساختیات کے مباحث کو جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساختیات کی اہمیت کے سلسلے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک مختصر سا اقتباس اس لسانی تحریک کی اہمیت اور معنویت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی قابلِ قدر تصنیف ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے دیباچے میں تھیوری کی بحث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تھیوری کی بحث بے شک نظریہ سازی کی بحث ہے لیکن اس کا مقصد نہ کوئی نئی تحریک چلانا ہے نہ ضابطہ متعین کرنا۔ نئی تھیوری سرے سے ضابطہ نافذ کرنے یا نظام وضع کرنے ہی کے خلاف ہے، بلکہ ہر طرح کی سابقہ ضابطہ بندی کی نفی کرتی ہے کیونکہ تمام ضابطے اور نظام بالآخر کلیت پسندی اور جبر کی طرف لے جاتے ہیں اور فکری اور تخلیقی آزادی پر پہرہ بٹھاتے ہیں۔ نئی تھیوری کی سب سے بڑی یافت زبان و ادب اور ثقافت کی نوعیت و ماہیت کی وہ آگہی ہے جو معنی کے جبر کو توڑتی ہے اور معنی کی طرفوں کو کھول دیتی ہے۔ متن ہرگز خود مختار و خود کفیل نہیں ہے کیونکہ اخذِ معنی کا عمل غیر مختتم ہے۔ یہ تاریخ کے محور پر اور ثقافت کے اندر ہے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید قرأت کا استعارہ ہے یہ بھی واضح رہے کہ تھیوری کیونکہ زندگی اور ثقافت سے الگ نہیں یہ سماجی عمل کا حصہ ہے اور اپنے وسیع تر تناظر میں نئی تھیوری موجودہ عہد کے انسانی کرائسس سے نمٹنے ہی کی کوشش ہے۔''

اگرچہ محولہ بالا پیراگراف میں ایک سے زیادہ باتیں ایسی ہیں جو ساختیات کے بعض ''مسلّمات'' سے میل نہیں کھاتیں، مثلاً یہ کہنا کہ متن ہرگز خود مختار و خود کفیل نہیں ساختیات کے بنیادی دعوے سے انحراف ہے، کیوں کہ ساختیات تو متن کو ''زبان کے اندر پہلے ہی سے لکھا ہوا'' پاتی ہے، اسی طرح معنی کے جبر کو توڑنے کی بات بھی کئی اخلاقی مباحث کا دروازہ کھولتی ہے، لیکن اس عبارت سے ادبی اسالیب سے متعلق لسانیات کے بعض امکانی موضوعات و مباحث کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

راقمِ مقالہ کی ساختیات میں ذاتی دلچسپی اِن مباحث کے ثقافتی اور سماجی مفاہیم کی بنا پر ہے اگرچہ ساختیاتی مباحث میں مجھے سماج اور ثقافت کے حوالے بہت کم ملے ہیں اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ ساختیاتی نقاد ابھی متن کو متن ہی کے حوالے سے دیکھنے اور سمجھنے کو علم و آگہی کی آخری غایت سمجھتے ہوں۔ ساختیات کے آخری رُجحانات میں نوم چومسکی کا قاری مرکز Reader Centred مطالعۂ متن ہے جو قاری کو متن کی معنوی تشکیل میں ادیب یا شاعر کا

شریکِ غالب ٹھہراتا ہے۔ یہ تحریک مغرب میں بہت حد تک ختم ہوتی جارہی ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔ گو مجھے یاد آتا ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے آغاز واواسط میں متنی تنقید کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی، اُردو میں متنی تنقید کا آغاز بہت حد تک میراجؔی کا رہینِ منت ہے جن کے متنی تجزیے (اس نظم میں) جدید تجزیاتی مطالعات کی اساس ثابت ہوئے، لیکن متنی تنقید کو بہت دیر تک چنداں اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ تا آنکہ مولانا صلاح الدین احمد کے شہرۂ آفاق ادبی مجلّے ''ادبی دنیا'' کے دورِ جدید میں نظموں کی متنی تنقید کا آغاز ہوا۔ جس میں شاعر کی ذات کو پسِ پردہ رکھ کر متن کے تجزیے کا فریضہ ایک سے زیادہ نقادوں کو سونپا جاتا تھا، لیکن یہ تجزیے کسی نئے علمِ زبان یا نئی لسانی آگہی کا کم ہی پتہ دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اطلاقی لسانیات کی شاخ ''اسلوبیات'' کی ادبی اسالیب میں دلچسپی اُردو تنقید میں نئے رجحانات پیدا کرنے کا باعث ہوسکتی ہے۔